انجمن ترقی اردو ہند

کا

ہفتہ وار اخبار

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
تین آنہ
تاریخ اشاعت
۲۲-۱۵-۸-۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۱
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڑھ

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۶ | علیگڑھ - ۱۵ مارچ ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۱۱

رفتار

خلیل الرحمٰن اعظمی

کل شام کو اپنے ایک بزرگ سے ملاقات کرکے واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ پوچھا "کہاں سے آرہے ہو؟" میں نے کہا "حضرت راز چاندپوری سے ملنے گیا تھا۔" بولے "یہ کون صاحب ہیں؟" اس سوال پر پہلے تو مجھے بہت غصہ آیا لیکن بعد میں سوچا کہ دراصل ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ راز چاندپوری سے واقف ہوں تو کیوں کر۔ وہ مشاعروں کے شاعر ہیں نہیں۔ ان کا کلام آج کل ادبی رسالوں میں شائع نہیں ہوتا۔ کوئی نقاد اپنے مضامین میں نہ اُن کا نام لکھتا ہے اور نہ ہی ان کے کسی شعر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں زمانہ پریس کان پور سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "دنیائے راز" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جوش، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، حامد اللہ افسر اور روش صدیقی وغیرہ کو نوجوان اور ہونہار شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ راز چاندپوری نے بھی روایتی انداز میں عشق و محبت اور مناظر قدرت پر چند خوبصورت نظمیں لکھی تھیں۔ کچھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے تھے۔ ان نظموں کو منشی پریم چند، سدرشن اور منشی دیا نرائن نگم نے خاص طور سے سراہا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم نے نہ صرف یہ کہ زمانہ میں ان کا کلام شائع کیا بلکہ اپنے رسالے کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی مقرر کیا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہا۔ اس کے بعد راز صاحب گورنمنٹ کی ملازمت کے سلسلے میں جبل پور چلے گئے۔ مزاج کے اعتبار سے یوں بھی خلوت پسند ہیں۔ کان پور میں "انجمن آئینہ ادب" کے نام سے ایک ادبی جماعت تھی جو کبھی کبھار جلسے اور مشاعرے کیا کرتی تھی۔ اس انجمن میں ان کے کئی قریبی دوست تھے جو کھینچ لے جاتے تھے اور اس طرح ہماری بہت "مروّت" ہو جاتی تھی۔ کان پور چھٹا تو یہ بھی ختم۔ اب شاعری کرتے تھے لیکن اپنی تسکین کے لئے۔

خود اپنا حال کہا خود اسی سے لطف لیا

حاصل ہے راز اتنا بس ذوق شاعری کا

چھپنے چھپانے کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ منشی دیا نرائن نگم بہت تاکید سے خط لکھتے تو ایک آدھ غزل یا نظم بھیج دیتے ورنہ وہ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری جب پختگی کو پہنچی تو ان کی بیاض میں دفن ہوکر رہ گئی۔ یہ زمانہ بڑی ہی جلد بازی اور پروپیگنڈے کا ہے۔ اپنا وجود منوانے کے لئے شاعر اور ادیب کو نہ جانے کیا کیا حربے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ مخزن اور زمانہ کی جلدیں کتنے لوگوں کے پاس ہیں اور اگر موجود ہیں تو نئی نسل انھیں بہت کم دیکھتی ہے۔ اردو رسالوں کے قاری کا حافظہ بقول اختر انصاری یوں بھی کمزور ہوتا ہے۔ کتنے ہی اعلیٰ درجے کے شاعر و انشاپرداز محض اس لئے لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئے کہ ان کی تحریریں یکجائی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ آج مہدی افادی، سجاد انصاری یا عظمت اللہ خاں کو کون جانتا۔ اگر ان مرحومین کی بکھری ہوئی تحریروں کو ان کے عزیز و احباب اکٹھا کرکے شائع نہ کرتے۔ اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے میر ناصر علی دہلوی، وحید اکبرآبادی، میر افضل علی، محمد حسین ادیب، اور میر ولایت علی بمبوق

کا نام تو شاید سنا ہو لیکن ان کی کوئی چیز شاید ہی انھوں نے پڑھی ہو۔ دور کیوں جائیے اقبال احمد سہیل، مسعود علی ذوقی، مرزا عباس بیگ مختصر اور مقبول حسین احمد پوری وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے بعض مخصوص امکانات کا جائزہ لیا لیکن ان کی خدمات سے لوگ اس لئے واقف نہیں ہیں کہ کسی پبلشر نے ان کے کلام کے مجموعے نہیں شائع کئے۔ عبدالقادر سروری نے "جدید اردو شاعری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس وقت جدید شاعری فیض، راشد، میراجی یا مجاز اور جذبی تک بھی نہیں پہنچی تھی بلکہ جوش اور حامد اللہ افسر وغیرہ سے عبارت تھی۔ سروری نے اس وقت اپنی کتاب میں راز چاند پوری کا بھی ذکر بعض ہونہار شاعروں میں کیا تھا لیکن ہونہار کے جب کچھ ہونے کے دن آئے تو وہ محفل سے غائب تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے یہ گمان ہوا۔

نہ دنیا مجھ سے واقف ہے نہ آئین محبت سے
میں جاؤں تو کہاں جاؤں نکل کر کنج خلوت سے　(راز)

لیکن اس "کنج خلوت" میں وہ دنیا کو خوبصورت بنانے کا خواب دیکھتا رہا۔ اس امید پر کہ

تصویر جہاں میں رنگ بھرنا
تخلیق جہاں سے کم نہیں ہے　(راز)

لیکن اس تخلیق کو بازار میں لائے تو کون لائے اور اگر یہ تصویر شہر کی دیواروں پر اشتہار بن کر چسپاں نہ ہوگی تو اس پر کس کی نگاہ پڑے گی۔ اس کے بارے میں اگر میں کچھ کہوں تو شاید لوگ پکار اٹھیں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" لیکن کیا کیا جائے کہ یہ مشک تو ابھی "نافۂ آہو" کی صورت میں ہے۔

بہرحال آج کی صحبت میں اپنی ذاتی بیاض سے راز چاند پوری کی غزلوں کے کچھ شعر ادھر ادھر سے سنانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

وہ آتش گل شباب پر ہے　　ذرہ ذرہ ہوا ہے روشن
ہے محو خرام ناز کوئی　　کانٹے کہیں تھام لیں نہ دامن

دلکش ہے دل نشیں بھی افسانۂ محبت　　شاید سنا سکوں گا تم کو کہیں کہیں سے

فسانۂ حسن ہے مصور بہ نقشہائے جہاں　　ہر ایک ذرہ یہ کہتا ہے تیرا بہار ہوں میں
جینے میں مزا ہے مجھے نہ مرگ بھی　　اب کیا کہوں خدا سے میں اب کیا دعا کروں
حاصل زیست ہے کیا میکدۂ ہستی میں　　تھی بادۂ امید تو ادا کرنا
لذت کش نظارہ ہے تیری نظر تو کیا
ابھی تو بے خودی ہو کر حیرت کہیں بچے
وفائے عشق کی روداد کہتے ہو مجھ کو　　جفائے حسن کا قصہ کہوں اگر فرصت ہو

آہ وہ دور زندگی، آہ وہ عہد سرخوشی
گردش روزگار سے خواب و خیال ہو گیا
غم ہائے دل گداز نے انساں بنا دیا
عالم خواب ہو رہا ہے مری بزم خیال کا

ہائے وہ میری آخری حسرت　　دل سے نکلی تھی جو دعا ہو کر
اپنے خلوص پر ہے مجھے ناز اتنا　　نشتر زنی سے فکر کی میں بے خبر نہیں
شاعر خوش خیال کی باتیں　　حسن بھی عشق باز ہوتا ہے
پابند قفس رہنا، مانوس قفس ہونا　　آساں کبھی ہوگا اس دور میں مشکل ہے
آئینۂ حسن زندگی تھا　　اب کشتۂ عشق آرزو ہوں
افکار روزگار سے دل مرجھا نہ جائے　　دہرا رہا ہوں قصۂ عہد شباب کو
کہاں سنتا تھا کوئی داستان عشق رسوائی
بنایا ہے مگر حسن بیاں نے داستانوں نے
یہ بزم دہر اور یہ ابتلائے روزگار　　مت پوچھئے زیارت انساں کئے ہوئے
دنیا بھی مری ہے زمانہ بھی خود فروش　　الزام وحشتی ہے مگر میرے سر ابھی
فلک حال دے مجھے درس نہ اضطراب کا
میری نگاہ میں ابھی جلوۂ بزم دوش ہے
کیا حسین اور تھیں کوئی زمانے بھر میں
لیکن اے دوست مرا حسن نظر عام نہیں
مایوس نہیں ہوں میں ابھی اپنی ہی جس سے　　مانا کہ مرا کوئی ہم آواز نہیں ہے
وہ ذوق شعرگوئی ہی سہی اے راز کیا کم ہے
بدلا تھا کسی صورت سے رنگ اپنی طبیعت کا

ان چند اشعار سے بھی یہ آواز پہچانی جا سکتی ہے۔ راز کے لب و لہجے میں گداز اور نشتریت کے ساتھ ایک سبکی ہوئی کیفیت ہے۔ ان کے یہاں متانت کے ساتھ ایک طرح کے خلوص اور قربت کا بھی احساس ہوتا ہے ان کی زندگی عام طور پر افکار و آلام میں گزری ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ زندگی کی تلخیوں کے ساتھ نباہ کرتے رہے ہیں۔ اس زہر کو انھوں نے اس طرح ہضم کر لیا ہے کہ ان کی آواز میں ایک طرح کی حلاوت پیدا ہو گئی ہے اور ان کی شاعرانہ مہارت سے قطع نظر یہ خود ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں۔ چاند پور کی سرزمین نے قائم کے بعد ایک اور شاعر پیدا کیا ہے جس کا منصب کم پہچانا گیا ہے۔

خط کتابت

صرف جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
کے پتے پر ہونی چاہئے۔

ہماری زبان

۱۵ - مارچ ۱۹۵۷ء

انجمن کی کانفرنس

فروری میں مجلس عام کا جو جلسہ ہوا تھا اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ۳۰، ۳۱ مارچ کو انجمن کی کانفرنس کی جائے۔ اس سلسلے میں جو خطوط لکھے گئے اور کارکنوں سے تبادلۂ خیالات کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تاریخیں اس اجتماع کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ ابھی انتخابات کے نتیجے نکل رہے ہیں۔ چند روز کے بعد نئی وزارتوں کے قیام کا مسئلہ سامنے آئے گا۔ عام طور پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہ نقشہ بن جائے تو آئندہ کام کی طرح ڈالیں۔ اپریل کے آغاز سے رمضان شروع ہو جائے گا۔ اور اس زمانے میں متعدد ممبروں کو شرکت میں زحمت ہوگی۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہ کانفرنس شروع مئی میں ہو۔ اس زمانے میں موسم کچھ گرم ضرور ہوگا مگر لوگوں کو قدرے فرصت بھی ہوگی اور اطمینان سے تمام مسائل پر غور و خوض ہو سکے گا۔ شاخوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ناشرین اور صحافی اپنے مسائل پر سوچی ہوئی باتیں کہہ سکیں گے۔ عنقریب کانفرنس کی تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا۔ مگر یہ طے ہے کہ یہ کانفرنس مئی کے پہلے ہفتے میں ہوگی۔

علی گڑھ میں اس وقت یونیورسٹی کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں اور مہمانوں کے قیام و طعام کے انتظامات کے سلسلے میں بھی دشواریاں ہیں۔ مئی میں اس کا بھی انتظام ہو سکے گا۔ ہمیں امید ہے کہ کانفرنس کی تاریخوں میں اس تبدیلی کو لوگ پسند کریں گے۔

راشٹر بھاشا پرچار سمتی اور اُردو

راشٹر بھاشا پرچار سمتی وردھا ہندی کی اشاعت کے سلسلے میں جو کام کر رہی ہے وہ قابل قدر ہے۔ اس کے چلانے والے اچھے اور نیک نیت لوگ ہیں مگر بعض اوقات ناواقفیت میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جن سے گمراہی پھیلتی ہے اور تعلقات کی روح مجروح ہوتی ہے۔ اس سمتی نے کچھ درسی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اس کی تیسری پستک میں جو جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی ہے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ سترھویں باب میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہندی جب فارسی لپی میں لکھی جاتی ہے تب اُسے اردو کہتے ہیں"

یہ بات صحیح نہیں۔ ہندی اور اردو دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں۔ دراصل یہ ایک بولی کے دو ادبی روپ ہیں اور اب دونوں کی مستقل اور آزاد حیثیت ہے۔ اس بنا پر دونوں کو دستور میں علیحدہ جگہ دی گئی ہے۔ اردو اگر ہندی رسم خط میں لکھی جائے تو ہندی نہیں ہوتی اور ہندی اگر اردو رسم خط میں لکھی جائے تو اردو نہیں کہلائی جا سکتی۔ فرق صرف الفاظ و اصطلاحات کا نہیں۔ روح۔ محاورات اور اسلوب کا بھی ہے۔ اس فرق کو کم کرنے کی کوشش اچھی ہے۔ مگر اسے نظر انداز کر کے دونوں کو ایک کہنا گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

اسی باب میں ایک دوسری جگہ ہندستان کی اہم بھاشاؤں کے نام لئے گئے ہیں۔ اُن میں اردو کا نام کہیں نہیں۔ ایک ایسی زبان کو جو ہندستان کی چودہ قومی زبانوں میں سے ہے۔ جس کے بولنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا ایک شاندار ادب ہے اور جس میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں نظر انداز کر دینا، زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ راشٹر بھاشا پرچار سمتی وردھا کی کتابوں میں ایسی غلطیاں افسوسناک ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی صحت کر دی جائے گی لیکن جو غلط فہمی اور گمراہی پھیل چکی ہے اس کا ازالہ کون کرے گا۔

شری بی جی کھیر

شری بی جی کھیر کا انتقال ایک قومی حادثہ ہے۔ کھیر صاحب ہمارے ممتاز قومی رہنماؤں میں سے تھے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ بمبئی کے بڑے وزیر، لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر اور سرکاری زبان کمیشن کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے ملک و قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اگرچہ سرکاری زبان کمیشن کی سفارشیں ابھی شائع نہیں ہوئیں لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے انھوں نے اس کے صدر کی حیثیت سے ہندستان کی تمام قومی زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ جہاں یونین کی سرکاری زبان کے متعلق انھوں نے نہایت متوازن خیالات ظاہر کئے اور اردو کے حامیوں اور کارکنوں کے سامنے انھوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی ہمت افزائی کی۔ ان کے انتقال سے گاندھی جی کی صف کا ایک اور مجاہد کم ہو گیا۔

اردو دنیا

شاندار روایات پچھلے ہفتے جناب مخدوم نظامی نے حیدرآباد آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے حیدرآباد کی شاندار ادبی اور تہذیبی روایات کا ذکر کیا اور اردو کے فروغ میں ان کی کوششوں کو سراہا۔ اس موقعے پر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے وسیع احاطے میں شہر کی ممتاز خواتین اور حضرات موجود تھے۔

اردو کالج

حیدرآباد (دکن) کے بعد اب بہار میں ایک اردو کالج کے قیام کی تجویز زیر غور ہے۔ معاصر "ہم لوگ" کی اطلاع ہے کہ ایوت محل میں قاضی سید کریم الدین صاحب ایڈوکیٹ ممبر راجیہ سبھا کے دولت کدے پر ایک خاص جلسے میں مجوزہ اردو کالج کے لئے ایک اکسپرٹ کمیٹی بھی بن گئی ہے۔

عوام کی زبان

جاورہ میں ایک شاندار مشاعرہ اندور کی خاتون لیڈر محترمہ زلمارانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ رانی صاحبہ نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ اردو ہندوستان کے عوام کی دستوری زبان ہے اسے کوئی برباد نہیں کرسکتا۔ مشاعرے میں شمیم فرحت کی نظم کشمیر بہت پسند کی گئی اور انکیس پانچ اداروں کی طرف سے میڈل دئے گئے۔

مزاحیہ مشاعرہ

لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے مارچ کے دوسرے ہفتے میں ایک دلچسپ مزاحیہ مشاعرہ نشر کیا گیا۔ مشاعرے میں شہر کے بہت سے اہل ذوق موجود تھے۔ شاعروں میں سے اختر پھپھوندوی، کبّن بیگ، شوقی بہرائچی، سرور شکستہ گنجوی، جمال ملیح آبادی کے علاوہ لکھنؤ سے آفتاب لکھنوی، بوالرم لکھنوی، رنگین لکھنوی، جھنجھٹ لکھنوی، تاوک لکھنوی، وحید لکھنوی، بازل لکھنوی، ناچیز لکھنوی اور عقا لکھنوی نے شرکت فرمائی۔

انتخابات اور اردو

جناب منظور الحسن صاحب برکاتی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک اطلاع دیتے ہیں۔

ہمارے صوبہ راجستھان میں ۲۵۔ فروری کو عام انتخابات شروع ہوئے۔ دوسرے صوبوں کی طرح یہاں بھی مختلف سیاسی پارٹیوں نے اپنے نمائندے کھڑے کئے اور انتخابات میں کامیابی کے لئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جن سے عوام میں مقبولیت اور رائے دہندگان کی حمایت حاصل کی جاسکتی ہے

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ٹونک اور جے پور اور راجستھان کے دوسرے اضلاع میں امیدواروں نے اپنا پروپیگنڈہ کرنے، اپنی آواز اور مقصد کو عوام تک پہنچانے کے لئے جس زبان کو انتخاب کیا وہ "اردو زبان" تھی۔

راجستھان، ہندوستان کا ایک ایسا صوبہ ہے۔ جہاں اردو زبان کو نہ صوبائی زبان کی حیثیت حاصل ہے اور نہ علاقائی۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے لاکھوں باشندے اردو زبان بولتے سمجھتے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو راجستھان کے چپے چپے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی انتخابی مہم میں نشرواشاعت اور پروپیگنڈے کے لئے ہر پارٹی اور ہر امیدوار نے اسی زبان کو اختیار کیا۔ درجنوں لیڈروں نے اس زبان میں تقریریں کیں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں اشتہار، پمفلٹ، پوسٹر اور ہینڈ بل اس زبان میں شائع کئے گئے۔

دلّی کے نامہ نگار لکھتے ہیں کہ الکشن کے سلسلے میں تمام پارٹیوں نے پوسٹر اور ہینڈبل وغیرہ اردو میں دل کھول کر استعمال کئے دلی کے گلی کوچوں اور سڑکوں کے اطراف کی دیواریں اردو پوسٹروں سے لپی ہوئی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن سنگھ نے بھی اسی "نامبارک زبان" میں اپنا پروپیگنڈہ زور شور سے کیا۔

حیدرآباد اور اطراف کی اطلاعوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں تو یہ رنگ اور جگہوں سے زیادہ تیز تھا۔ تلگو بھی ساتھ ساتھ رہی مگر اردو کا حصہ غالب رہا۔

یو۔ پی کانگریس کے شعبہ نشرواشاعت نے بڑے دھڑلے کے ساتھ اردو استعمال کی۔ بے شمار پوسٹر اور دیگر مطبوعات اردو میں شائع کی گئیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کو تو اس کے استعمال میں کوئی تکلف پہلے ہی سے نہ تھا البتہ حکومت نے اپنی روایتی روش میں فرق نہیں آنے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے بڑے بڑے کرتا دھرتاؤں نے اردو ہی میں عوام کو مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

انجمن کی خبریں

دہلی

یوم غالب

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی نے حسب معمول اس سال بھی 'یوم غالب' بڑے اہتمام سے منایا ۲۲ فروری ۵۷ء ۲ بجے چونسٹھ کھمبا بستی نظام الدین میں مزار غالب کے قریب ۳ بجے دہلی کے ادیب، شعراء، صحافی اور علم دوست حضرات اور عوام کا ایک اجتماع یوم غالب کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے جمع ہوا۔ جلسہ سے قبل مزار غالب پر گل افشانی کی گئی۔ اس موقع پر مزار پر چادر چڑھانے کے علاوہ مقبرے کی جالیوں کو پھولوں کے ہاروں اور بجلی کے رنگ برنگی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔

محبت کی نشانی

۲ بجے کے قریب جناب خواجہ غلام السیدین سکریٹری مرکزی وزارت تعلیم کی صدارت میں جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔ پنڈت سندر لال صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ دہلی نے صدارت کی تحریک پیش کرتے ہوئے حضرت غالب کو خراج عقیدت پیش کیا اور اردو کے متعلق فرمایا کہ یہ محبت کی نشانی ہے جسے اس ملک کے بہترین دماغوں نے مل جل کر بنایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زبانیں ہمیشہ دوسری زبانوں کے ملاپ اور اتحاد سے بنتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان بھی دوسری زبان کو مٹا کر یا دبا کر ترقی نہیں کرسکتی۔ اردو زبان کی ہمہ گیری پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت سندر لال نے کہا کہ جب میں روس گیا تھا تو وہاں میں نے ایک روسی پروفیسر کو ایسی شستہ اور بلیغ اردو میں تقریر کرتے ہوئے سنا کہ جس کو سن کر شاید اہل دہلی کو بھی رشک آجاتا۔ موصوف نے فرمایا کہ اردو ہندی ماں جائی بہنیں ہیں اس لئے ہندی والوں کو اردو سے نفرت نہیں کرنا چاہئے، پریم اور محبت سے ہندی اور اردو دونوں ہی کا بھلا ہوگا۔ آخر میں پنڈت جی نے فارسی کا یہ شعر پڑھا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں مرزا غالب کی شاعری اور نثر نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری میں جہاں ایک طرف بھرپور رنگ تغزل اور حسن و عشق کے دعوے اور ہجر کی بیقراری نظر آتی ہیں تو دوسری طرف اس میں صوفیانہ بلندیاں معرفت کی گہرائیاں اور فلسفیانہ تجربے کے شاہکار رہتے ہیں۔ عشق اور مجاز جو اردو اور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں اپنی تمام تر رعنائیوں اور صداقتوں کے ساتھ غالب کی شاعری میں موجود ہیں۔ غالب کی شاعرانہ طبیعت اور حساس فطرت کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ غلام السیدین نے کہا کہ وہ صحیح معنوں میں انسان دوست اور صلح کل فطرت رکھتے تھے ساتھ ہی انانیت پسند بھی تھے اس لئے زمانہ کی ہر ٹھوکر کو انھوں نے ہمت سے جھیلا لیکن شکست کبھی قبول نہیں کی۔ غالب غم روزگار اور ماتم زندگی کے ہر حملہ کا شکار ہوئے مگر ان کے لب و لہجہ میں کوئی تلخی نہ آئی۔

غالب کے اشعار اور ارشادات کی عمومیت کا ذکر کرتے ہوئے سیدین صاحب نے کہا جس طرح زبان انگریزی کے ادبی حلقوں میں شیکسپیر کی تحریروں کے ذکر کئے بغیر گفتگو نامکمل اور پھیکی رہ جاتی ہے اسی طرح اردو کے حلقوں میں غالب کے اشعار اور ارشادات کے استعمال کے بغیر گفتگو ادھوری رہ جاتی ہے۔ غالب کی خوبیوں کا اقتباس پیش کرتے ہوئے سیدین صاحب نے کہا کہ غالب کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے اور ان کا انداز بیان اتنا رنگا رنگ اور دلکش ہے جو دوسرے اردو شعراء کو میسر نہیں۔ آخر میں سیدین صاحب نے غالب کے خطوط سے اقتباسات پڑھ کر سنائے اور کہا کہ غالب کا دل و دماغ کوتاہ نظری، عصبیت اور فرقہ پرستی سے بالکل پاک تھا اور مذہبی قیود سے ان کی نظر بہت اونچی تھی اس لئے بحیثیت انسان بھی وہ ہندوستان کی ایسی محبوب اور محترم ہستی تھے جن کو آج بھی ہر فرقہ کے لوگ اپنا ہی سمجھتے ہیں۔

خطبۂ صدارت سے قبل شمیم کرہانی نے ایک دلکش نظم سنائی۔ یہ نظم مزار غالب پر بیٹھ کر کہی گئی تھی اور اس کا عنوان تھا "غالب"۔

بیگم صالحہ عابد حسین نے ایک مزاحیہ مضمون پڑھا جس کا

عنوان تھا غالب کا یہ شعر ؎

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اس افسانوی مضمون میں غالب کے سادہ اور پرکار اشعار نہایت دلاویز انداز میں غالب کی بیوی امراؤ بیگم سے منسوب کردئے گئے تھے بیگم صالحہ عابد حسین کے انداز نگارش کو بیحد پسند کیا گیا اور حاضرین نے اس اچھوتے طرز بیان کی پرزور تالیوں سے داد دی۔

مقالات اور تقاریر کے درمیان غالب کا فارسی اور اردو کلام جناب عرش ملسیانی اور جناب شہریار پرواز نے ترنم سے پڑھا۔

غالب کی طرح میں ترتیب دئے ہوئے پروگرام کے تحت جناب تلوک چند محروم اور حضرت مائل حیاتسی نے فارسی میں اور بدرش صدیقی ساغر نظامی۔ گوپی ناتھ امن۔ جگن ناتھ آزاد حسن نعیم نے اردو میں غزلیں سنائیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے غالب بحیثیت انسان کے عنوان پر بڑے دل نشیں انداز میں تقریر کی۔ آخر میں شریمتی سرلا کپور نے غالب کی غزل دلاویز ترنم میں سنائی اور اس غزل پر یوم غالب کی پہلی نشست ختم ہوئی

یوم غالب میں شرکت کرنے والوں میں روس کے تین اردو ریسرچ اسکالرز بھی شامل تھے اور جلسہ کے اختتام پر ان روسی مہمانوں نے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں سے تبادلۂ خیال کیا۔

غالب

یہ وہ نظم ہے جسے شمیم کرہانی نے غالب کے مزار پر بیٹھ کر لکھا اور وہیں انجمن کے جلسے میں سنایا تھا۔

کہ جہ اہل نظر مدفن غالب ہے یہی — محو خواب اک دل بیدار اسی خاک میں ہے
ہے اسی قبر میں گنجینۂ معنی کا طلسم — جنس حکمت کا خریدار اسی خاک میں ہے
ہے یہیں دفن حریف مے مردافگن عشق — بادۂ غم کا قدح خوار اسی خاک میں ہے
سو رہا ہے یہیں نقاش اجنتائے غزل — ادبی تاج کا معمار اسی خاک میں ہے
شام دیناد مرد ابروشفق ہے یہیں دفن — سحر چشمہ و کہسار اسی خاک میں ہے
ابر آلودہ سحر کا ہے شرابی یہیں قید — چاندنی رات کا میخوار اسی خاک میں ہے
صاحب سیف تھے سو پشت سے جسکے اجداد — ہائے وہ ترک طرحدار اسی خاک میں ہے
قیدی رشتہ تسبیح یہیں ہے محبوس — لیے حلقۂ زنار اسی خاک میں ہے
دیکھ کر شہد جو کعبے کو پلٹ آتا تھا — ہائے وہ جذبۂ خوددار اسی خاک میں ہے
یہیں مدفون ہیں خود بینی و دانش کے صنم — ایک بت خانۂ پندار اسی خاک میں ہے
شارح خواب تخیل ہے یہیں پوشیدہ — خالق سیرت و کردار اسی خاک میں ہے
تھا جو ناکردہ گناہوں کی سزا کا طالب — وہ جواں مرد گنہگار اسی خاک میں ہے
ڈالتا ہے جو زمانہ پہ ابد کا پرتو — میرے ماضی کا وہ مینار اسی خاک میں ہے
ہم سخن ہم ہیں غالب کے طرفدار رہیں — ادب ہند کا شہ کار اسی خاک میں ہے
معنی و ہیئت و اسلوب کا سرخیل سپاہ — فکر کا قافلہ سالار اسی خاک میں ہے

جس کی رعنائی افکار پہ عالم کو ہے رشک
ایشیا وہ ترا فنکار اسی خاک میں ہے

یوم غالب کی دوسری نشست سات بجے شام کو شروع ہوئی اس نشست میں غالب کا کلام دلی کے قوالوں نے پیش کیا حاضرین نے بہت ذوق و شوق سے سنا اور بیحد پسند کیا۔

دوسری نشست بخیر وخوبی آٹھ بجے رات کو ختم ہوئی۔

سید احمد جواد (جوائنٹ سکریٹری انجمن شاخ دہلی)

اردو کا مستقبل

جناب ساغر نظامی نے مارچ کے پہلے ہفتے میں حیدرآباد دکن کے اردو کالج میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو نے عوام ہی میں جنم لیا ہے اور عوام ہی نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ حکومت کی اسے کو کبھی پشت پناہی حاصل نہیں رہی۔ انھوں نے اردو کالج کے قیام پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے والوں کے لئے بلاشبہ یہ ایک مژدہ ہے۔ امید ہے کہ یہ اقدام ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اردو کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

کشمیر میں انجمن

بزم اردو کشمیر کی مجلس عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ کل ہند انجمن ترقی اردو کی شاخ کشمیر میں قائم کردی جائے تفصیل اطلاع آئندہ اشاعت میں دی جائے گی۔

غیر معروف شعراء (۲)

خیراتی خاں دل سوز

فخرالدین احمد

خیراتی خاں دلسوز افغان نسل کے اور سپاہی پیشہ تھے۔ خمخانۂ جاوید میں انھیں باشندۂ علی گڑھ لکھا ہے۔ لیکن یہ دراصل کچل کے رہنے والے تھے جو علی گڑھ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے۔ قیام دہلی اور بعد کو بھی ثابت ہے۔ خوش طبع، یار باش، اور لطیفہ گو تھے اس لئے نواب ظفریاب خاں خلف سمرو کے پاس رسائی حاصل کی اور عمر اس کی ملازمت و رفاقت میں بسر کرنے لگے۔

مظفر الدولہ مختار الملک نواب ظفریاب خاں بہادر نصرت جنگ خود شاعر تھا اور صاحب تخلص کرتا تھا۔ ذکا لکھتا ہے کہ وہ سپہ گری کے علاوہ موسیقی اور مصوری میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ علوم رسمیہ سے بہرہ اندوز تھا اور دہلی کے قیام کے دوران میں اس کے یہاں مشاعرے اور مراختے کی مجلسیں مرتب ہوتی تھیں جن میں جمیع شعرائے دہلی شریک ہوا کرتے تھے۔ ذکا بھی اکثر اس محفل میں شریک ہوتا اور طرحی غزلیں پڑھتا تھا۔ شیفتہ نے اسے دلسوز کا شاگرد لکھا ہے۔ مصنف طبقات سخن کا قول کہ دلسوز کے والد سمرو کے بیٹے کی صحبت میں تھے غالباً صحیح نہیں ہے۔

قاسم اور کریم الدین دلسوز کو شاگرد نثار اللہ فراق لکھتے ہیں لیکن نساخ اور شیفتہ انھیں نصیر دہلوی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ خوب چند ذکا جو خود شاہ نصیر کا شاگرد ہے لکھتا ہے کہ دلسوز اپنا کلام فراق اور نصیر دونوں کو دکھاتا ہے۔ کلام کے بارے میں لکھا ہے، "جودت طبع بدرجۂ اتم دارد کہ غزلیات و قصائد و رباعی وغیرہ اردو بہ متانت و فصاحت سرانجام مے یابد۔ کاوش مزد دارش رتبہ پیدا کردہ و خالی از کیفیت و برجستگی نیست"

زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ شراب نوش بلا کے تھے۔ طبقات سخن میں ہے کہ بعد کو انھوں نے شراب نوشی چھوڑ دی تھی۔ جوانی ہی میں جے پور میں وفات پائی۔ خمخانہ میں سال وفات ۱۲۵۸ھ درج ہے۔

دیوان غالباً ترتیب نہ پا سکا۔ تھوڑے بہت شعر تذکروں میں ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ کسی تذکرے میں بھی ان کی کوئی مکمل غزل دیکھنے میں نہیں آئی۔ تیرھویں صدی کی ابتدا کی مرتب کردہ ایک بیاض میں جو غالباً سعادت یار خاں رنگین کے پاس رہ چکی ہے اور جس میں کچھ اضافے رنگین کے قلم کے معلوم ہوتے ہیں۔ دلسوز کی چند غزلیں موجود ہیں لیکن ان کی بھی تعداد زیادہ نہیں (اس بیاض کا تعارف آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمایئے)

خیراتی خاں دلسوز کے ہاتھ کی تحریر راقم الحروف کو صرف ایک جگہ دیکھنے میں آئی۔ یہ تحریر کتب خانہ یونیورسٹی کالج (الجبرا یونیورسٹی، دانکاشی پٹنہ) میں محفوظ ہے۔ وہاں دیوان سودا کا ایک نسخہ ہے جو مکمل طور پر دلسوز کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں ترقیمہ کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

"بہ اہتمام رسید این کتاب تصنیف مرزا رفیع سودا مغفور بتاریخ بیست و پنجم مشہر رمضان المبارک سنہ جلوس ..... شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ الراقم ضعیف نحیف داعی شب و روز خیراتی خاں دلسوز حسب الارشاد نواب صاحب قبلہ خدایگان، قیاض حاتمیان، نوازش فرمائے بیکسان، نواب ظفریاب خاں بہادر دام اقبالہ و جلالہ"

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ یہ اشعار "بیاض رنگین" سے لئے گئے ہیں۔

قراردے گئی اک نازنین پردے میں ۔۔۔ نگاہ رہ گئی رخ کے مبین پردے میں

○

اس شعلہ رو سے کل جو مری آنکھ لڑ گئی ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ بجلی سی اک مجھ پہ پڑ گئی

میری ادا اس کی آہ نہ کیسا وہ کچھ بنی ۔۔۔ گر آج بن گئی تو وہیں کل بگڑ گئی

آتی ہے آنچ سینے سے ہر دم جو ہونٹ سے — کس کی نگاہ مست مرے دل میں گڑ گئی
اس دل سے زندگی مری آنکھوں میں آ گئی — جس دل سے میری جان وہ مجھ سے بچھڑ گئی
پہلے سے ہی زبان کو بہتر تھی خموشی — دل سوز اب تو کیجئے کیا بات بڑھ گئی

○

گزری شب فرقت تو نپٹ درد و الم سے — پند مجھے دل کیوں کہ کئے گا ترے غم سے
کچھ دل کو ہوس سیر گلستاں کی نہیں ہے — بہتر ہے گلی اس کی ہیں باغ ارم سے
بیتابی سے بے چین کیا ہے مرے دل میں یہ شعلہ — بجھتا نظر آتا نہیں اب دیدۂ نم سے
ٹکراتے ہیں دیوار سے سر تکتی ہیں آنکھیں — ملتا ہے جو دیدار ترا کچھ خواب میں ہم سے
احوال گذشتوں کا کوئی پوچھے کس سے — جو کوئی گیا پھر نہ پھرا ملک عدم سے
تا عمر مگر پاؤں میں دل سوز کے زنجیر — آباد ہے ویرانہ یہ تنگ اس کے قدم سے

○

ہر گھڑی جھڑکی اور ڈھٹائی ہے — یہ کوئی طرز آشنائی ہے
تیرے چہرے کو ماہ کیوں کر کہوں — اس میں ایسی کہاں صفائی ہے
دل پھنسا کر کے اس کی زلفوں میں — جی کو ناحق بلا لگائی ہے
ابھی دل میں بھڑک اٹھی تھی آگ — آنسوؤں نے مرے بجھائی ہے

تو جو حیراں ہے آج اے دل سوز
کس کی تصویر یاد آئی ہے

باقی

○

مراسلات

ہماری صحافت

آپ کا ادبی و تعلیمی اخبار "ہماری زبان" زبان اردو کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ امر حقیقت پسند ہی فرزندان اردو کے لئے باعث مسرت ہے۔ ایک مشکل جو عام طور پر لائبریریوں کے لئے یا خانگی طور پر اخبارات اور رسالوں کے جاری کرتے وقت پیش آتی رہتی ہیں کہ کون سی ریاست میں کون سی نوعیت کے اردو اخبار یا رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اگر ادارہ ہماری زبان بھارت دیس میں اردو اخبارات اور جرائد کی معلومات حاصل کر کے ہماری زبان میں قسط وار ہی کیوں نہ چھاپتا رہے تو اردو جاننے کے لئے بڑے فائدے کا باعث ہوگا۔ اگرچہ یہ کام بڑا اہم اور دقت طلب ہے مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس پر غور فرمائیں

محمد عثمان امیٹری (ریاولی)

اردو لغت

اردو لغت کا کام ضروری ہے لیکن اس کے لئے کافی وقت، سرمایہ اور کتابوں کی ضرورت ہوگی۔ ابھی تک لکھنؤ اور دہلی کی اردو پر کتابیں لکھی گئی ہیں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اردو پر لغت تیار کیا جائے تو زبان کو کافی وسعت حاصل ہو سکے گی۔

ہسٹری آف اردو لٹریچر کے ترتیب و تدوین کی خبر سے مسرت ہوئی۔ امید ہے کہ یہ ضروری کام بھی انجام پا جائے گا۔

عربی ادب کی تاریخ پر اردو میں کوئی کتاب نہیں ہے اگر کانفرنس اس ضرورت کو محسوس کرے تو میں اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکوں گا۔

سید مجتبیٰ حسن کاموں پوری
ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اہل ادب کا مشاعرہ

بزم اہل ادب توپ خانہ امین کی جانب سے ۱۷ فروری ۵۷ء کو ایک طرحی مشاعرہ زیر صدارت عطا الٰہی صاحب عطا صدیقی گوایاری منعقد ہوا۔ سلطان احمد صدیقی صاحب (علیگ) نے نائب صدر کے فرائض انجام دئے۔

مندرجہ ذیل شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سرفراز فرمایا۔
(۱) عطا صدیقی گوایاری۔ سلطان احمد صدیقی۔ حامی مہدی۔ حسرت قریشی۔ کاشف الہاشمی۔ راہی صابری۔ محمود۔ نسیم ادیبی۔ صابر گلشن آبادی۔ مقصود صاحب۔ شبنم ادیبی۔ قمر اندوری۔ ڈاکٹر فرید*

* ساحر گلشن آبادی۔ چندہ جبل پوری۔ دولت صحرا واڑی۔ عبد الکریم صدیقی۔ فہیم سنگاپوری۔ شری سدھیشر۔ عبد الرحیم قیس۔ عبد العزیز آزاد۔ محمد علی دلکش۔ مشاعرہ ۹ بجے رات سے ایک بجے رات تک ہوتا رہا۔

(صابر گلشن آبادی پروپیگنڈہ سکریٹری)

معاصرین

رودکی کا مزار

وسط ایشیا کے بہت سے شہروں اور گاؤں کے باشندے اپنے علاقہ کو عظیم شاعر اور موسیقار، عبداللہ ابوجعفر رودکی کا وطن بتانے کے لئے مدتوں سے بحث کرتے آئے ہیں۔ رودکی کا ہزار دیگ صد سالہ یوم پیدائش تھوڑے ہی دنوں میں منایا جانے والا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اس شاعر کی جائے ولادت و وفات کا تعین نہیں کیا جا سکا تھا اور نہ کوئی ٹھیک طور سے اس کا حلیہ اور اس کی مشابہت بیان کر سکتا تھا۔ اسلام کسی انسان کی شبیہ بنانے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں رودکی کی شکل و شباہت کا اندازہ کسی قدر ان اشعار سے ہو سکتا تھا جن میں شاعر نے خود اپنا ذکر کیا ہے۔

صدرالدین عینی نے بعض عربی کتابوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رودکی کی ولادت اور وفات پنج رود کے علاقے میں ہوئی تھی جو پنج کند (علاقہ لینن آباد، تاجکستان) سے ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ انھوں نے پنج رود کے گاؤں میں رودکی کی قبر کا بھی تعین کر دیا تھا۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے تاریخی علوم اور سوویت علم الاقوام کے ماہر پروفیسر گراسیموف نے قبر کھولی جس میں روایت کے مطابق رودکی مدفون تھا۔ قبر میں ایک ڈھانچہ ملا۔

پروفیسر گراسیموف کا کہنا ہے "ہمارے سامنے صرف یہی کام نہ تھا کہ ہم رودکی کی شبیہ بنا لیں بلکہ اس بات کو بھی پایۂ یقین تک پہنچانا تھا کہ یہی جو ڈھانچہ ملا وہ رودکی ہی کا ہے ہمیں روایتوں اور خود شاعر کے کلام سے یہ معلوم تھا کہ رودکی نابینا تھا اور اس کے دانت نہیں تھے۔ قبر میں جو کھوپڑی ملی ہے اس میں بھی دانت نہیں تھے۔ پھر سر کی ہڈی کی مخصوص امتیازی ساخت یہ بتاتی ہے کہ یہ کھوپڑی ایک نابینا انسان کی ہے۔ اب ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے رودکی کی قبر پا لی ہے۔

جدید ترین سائنس کے مطالعے سے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ رودکی نے ۸۰۔۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(سوویت دیس)

اخبارات کا سروے

پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم ڈپارٹمنٹ نے اخبار پڑھنے والوں کا ایک سروے کیا ہے۔ طلبہ نے ایک سو روپیہ سے لے کر ایک ہزار روپے تک کی آمدنی کے ۳۰۲ لوگوں سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ ان کی اخبار بینی کا اندازہ کیا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں ۵۰ فیصدی انگریزی اخبارات، بیس فیصدی دیسی زبانوں کے اخبار پڑھتے ہیں اگر کے ہاتھوں اردو اور ہندی اخبارات پڑھنے والوں کا تناسب بھی معلوم کر لیا جاتا تو زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہوتا۔ لیکن پھر بھی اس سروے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقے میں انگریزی اخبارات زیادہ مقبول ہیں۔ کچھ تو اس لئے کہ انگریزی اس دور میں باقی رہی اور ان کے فیشن میں فرق نہ آئے۔ اسی لئے انگریزی اخبارات کا معیار زیادہ بلند ہے اور دیسی اخبارات اپنا خرچہ بھی نہیں نکال سکتے۔

(مجیبہ)

اردو فلم

معاصر فلمکار ہفتہ وار بمبئی نے مورخہ ۳ مارچ ۱۹۵۷ء جلد ۲ شمارہ ۹ میں اردو فلم کی مقبولیت پر ایک ایڈیٹوریل لکھا ہے جس کا اقتباس یہاں دیا جاتا ہے۔

"گزشتہ ۲۰ سال میں ہماری متکلم فلموں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بنی ہوئی بڑی سے بڑی فلم بھی ایک علاقائی زبان کی اعلیٰ فلم کے مقابلے میں ہر اعتبار سے زیادہ کامیاب اور مقبول ثابت ہوتی ہے جن لوگوں نے ابھی اقبال چاریہ کو بنگالی فلم "شش" میں دیکھا ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اس نے یوسف خاں کی اردو فلم "ش" کی اداکاری کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ کر معیاری اداکاری پیش کی تھی۔ مگر ایک ہی فلم کے بعد یوسف خاں دیپ کمار بن گیا اور ابھی اقبال چاریہ کے لئے ابھی دلی دور ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تقریباً بنگالی زبان کی ہر فلم اردو زبان کی فلم سے کہیں زیادہ معیاری ہوتی ہے مگر مقبولیت اور کامیابی میں اردو زبان کی فلم کا کبھی مقابلہ نہیں کر پاتی علاقائی فلموں کے اداکار اپنی ہر فلم میں ان کی خوبیوں کو پہچانتے ہیں مگر ان کی جانب کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہے کہ اردو فلموں کے ایک معمولی اداکار کے لئے فلم بیں نظریں بچھائے رہتے ہیں۔ فلم سازوں کی ایک بڑی اکثریت خصوصاً بنگالی فلم ساز و جانچ کار، بہت پہلے سے اس راز کو جانتے ہوئے ہیں کہ

اپنی فلموں کو کامیاب بنانے کے لئے عام فہم اردو کا سہارا لینا بھی ضروری ہے اور جب بھی کوئی خود سر اور ہٹ دھرم فلم ساز اس خصوصیت سے منہ موڑ کر اپنی بانی کو ہندی زبان کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ بولنے پر مجبور کرتا ہے تو اس کی اچھی بانی اس کا بیڑا غرق کر دیتی ہے اور متواتر وہ کئی سال تک اپنے بجٹ سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا۔ روز کے بڑھتے ہوئے بین الاقوامی تعلقات کے پیش نظر عالمی مارکیٹ کے لئے وہی فلم کسی حد تک منافع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اردو زبان میں بنائی جائے گی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان کی ہر فلم کو سنسر بورڈ کے سرٹیفکیٹ میں ہندی لکھا جاتا ہے مگر حکومت اور سنسر بورڈ کے ممبران کتنے ہی تنگ نظر کیوں نہ ہو جائیں "لالہ پٹ رانی" اور فلم "مرزا غالب" کی زبان کا فرق یہ تنگ نظری دور نہیں کر سکتی فلم بین طبقہ درخت گننے کا عادی نہیں اس کو پھل کھانے اور مٹھاس سے لذت حاصل کرنے سے مطلب ہے اردو کو کوئی بھی نام دیا جائے اردو اردو ہی رہے گی۔ اور جو فلم ساز اپنی فلموں کو مقبول عام بنانا چاہتے ہیں وہ اس بنیادی راز سے بخوبی واقف بھی ہیں۔

(فن کار بمبئی)

اُردو کا مستقبل

آسنسول کالج کا مشاعرہ

آسنسول کالج کے اردو داں طلبہ کی انجمن "فروغ ادب" کے زیر اہتمام کالج کا پہلا شاندار مشاعرہ کالج ہال میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت کالج کے وائس پرنسپل شری اے۔ کے۔ بنرجی نے فرمائی۔ سب سے پہلے انجمن فروغ ادب کے جنرل سکریٹری کی انگریزی اور اردو رپورٹ عطا الرحمن کیف اور زیڈ۔ اے خاں نے باری باری پڑھ کر سنائی۔ رپورٹ میں آسنسول کالج میں اردو کی تحریک کی مختصر تاریخ بیان کی گئی تھی۔ نیز کالج کی گورننگ باڈی سابق پرنسپل شری پی۔ بی۔ بھٹاچاریہ اور موجودہ پرنسپل شری بھوانی رائے اور اساتذہ کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ اردو داں طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں اور یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ اب تک انہیں جس طرح ان کا تعاون حاصل رہا ہے آئندہ بھی ہمیشہ اردو داں طلبہ کے ساتھ ان کی ہمدردیاں جاری رہیں گی۔ رپورٹ میں ٹیچرز ٹریننگ، انڈر گریجویٹ ہندی اور بنگلہ کے سیکشن کے طلبہ کا بھی شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ وہ اردو کی ہر تقریب میں پورے جوش سے ساتھ دیتے ہیں اور انہیں کامیاب بنانے میں اردو داں طلبہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

مشاعرے کے آغاز سے پہلے انجمن فروغ ادب کی وال میگزین "خیابان" بابتہ ۶۰-۱۹۵۹ء کے سب سے بہترین افسانہ اور نظم لکھنے پر جناب زیڈ۔ اے خاں اور ادریس صدر کو ایک ایک کتاب انعام میں دی گئی۔ ادریس صدر کو مشاعرے میں ایک گیت پیش کرنے پر ہندی طلبہ کی انجمن ہندی ساہتیہ پریشد کے سکریٹری نے بھی ایک انعام دینے کا اعلان کیا۔

جناب میاں ظفر احمد نے اردو ہندی کے مسئلے پر ایک نہایت جامع تقریر کی۔ ہندی ساہتیہ پریشد کے سکریٹری نے اردو کے گیت پر جو انعام کا اعلان کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے یہاں ہندی اور اردو کے طلبہ کے اندر ایک دوسرے کے لئے جو جذبہ خیر سگالی دیکھا ہے اسے دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو گیا لگتا ہے کہ اردو کا مستقبل ہندستان کی نئی نسل کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔

آخر میں انجمن فروغ ادب کے صدر پروفیسر شانتی آریہ نے اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری میں قومیت اور حقیقت پسندی کا بھرپور احساس پایا جاتا ہے

(اقتباس از عبرت کلکتہ)

اطہر ہاپوڑی کا انتقال

نفیس سندیلوی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ مشہور استاد و محقق فن شاعر مولانا اطہر ہاپوڑی نے ۲۵۔ فروری ۱۹۶۰ء کو بوقت صبح بمقام کراچی اس جہان فانی سے سفر آخرت فرمایا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۷ سال کی تھی۔ پچھلے سال مارچ ۱۹۵۹ء میں آپ "کل راجستھان اردو کنونشن" میں شرکت کی غرض سے کراچی سے جے پور تشریف لائے تھے۔ انجمن ترقی اردو راجستھان نے اپنی رپورٹ میں آپ کی اردو خدمات کو خاص طور سے تسلیم کیا ہے۔

امیر، داغ، تسلیم و جلال، ظہیر و حالی کی صحبتوں میں آپ نے غزلیں پڑھی تھیں۔ مرزا کمال الدین متبحر ژند ایرانی شاعر دہلوی اور جلال لکھنوی سے اکثر مسائل شعری پر بحثیں ہوئی ہیں۔

آپ رام پور، گوالیار، جے پور اور ٹونک وغیرہ ریاستوں میں وکیل و منصف رہے۔ ۳۰ سال جے پور میں قیام رہا ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان تشریف لے گئے۔ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔
(۱) گلستان اطہر۔ بہت ضخیم دیوان ہے جو ۱۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے (۲) مجموعہ قصائد اردو (۳) مجموعہ فارسی غزلیات و قصائد (۴) تحقیقات تاریخ و مراثی و سلام (۵) رسالہ تحقیقات الفاظ (۶) جدید عروض ناتمام (۷) اصلاح شعر مرتبہ نفیس سندیلوی (۸) مثنوی لیلۃ الاسریٰ نعت میں شب معراج کا حال ہے (۹) مکتوبات شعری تحقیقی اور علمی خطوط کا مجموعہ (۱۰) لغات دو حصے۔

لکھنؤ

احتشام حسین

لکھنؤ کو چاہے رام چندرجی کے بھائی لچھمن جی نے آباد کیا ہو یا راجہ یدھشٹر کے پوتے، راجہ جنم جی نے یہ خطہ رشیوں اور منیوں کو اپنے آشرم بنانے کے لئے دے دیا ہو، یہ شہر بہت قدیم ہو یا اکبری عہد سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن اودھ کا علاقہ قدیم الایام سے تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کی علمی اور ادبی مرکزیت البتہ اٹھارویں صدی میں ظاہر ہوئی جب یہاں باقاعدہ اس سلطنت کی بنیاد پڑی جسے آسانی کے لئے اودھ کی حکومت کہہ سکتے ہیں اور جس کا خاتمہ ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ تباہی اور جاگیرداری نظام میں شہروں اور مرکزی مقاموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جس جگہ بادشاہ، امرا یا نوابین اپنے دربار کرتے ہیں وہی جگہیں تہذیبی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ قدیم تاریخوں میں قاہرہ اور بغداد، اصفہان اور شیراز، لندن اور پیرس، ایتھنس اور روم، قسطنطنیہ، قرطبہ، ٹکسلا اور نالندہ، سمرقند اور بخارا، پاٹلی پتر اور بنارس اسی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب ۱۷۲۰ء کے قریب لکھنؤ کو بھی اودھ کا دارالسلطنت بننے کا موقع ملا تو اس کو بھی تہذیبی اور علمی حیثیت حاصل ہو گئی اور قدرے سیاسی امن اور معاشی فارغ البالی کی وجہ سے تھوڑی ہی مدت میں "ہند اسلامی تہذیب" کی وہ نئی شکل وجود میں آ گئی جو بعض حیثیتوں سے دہلی اور دوسرے مقامات کی تہذیبوں سے ممتاز اور مختلف تھی اور جسے عبدالحلیم شرر نے "مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ" قرار دیا ہے۔

علم و ادب کی روایتیں تاریخی اور جغرافیائی حالات، معاشی اور سماجی محرکات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا تسلسل ایسے پہلو پیدا کر دیتا ہے جو کسی خاص مرکز کی تہذیب اور ادب کا امتیازی نشان بن جاتے ہیں اور اسی سے ربط یا وابستگی رکھنے کی بنا پر ایک مرکز یا دبستان کے لوگ دوسرے مرکز کے لوگوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ میں جس تہذیبی اور تمدنی زندگی کا نشو و نما ہوا وہ اپنی بنیادوں میں اس زندگی سے مختلف نہ تھی جو کئی صدیوں میں ہندستان کے مختلف علاقوں اور خاص کر دہلی میں تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بھی وہی معاشی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی تصورات وابستہ تھے جن کی نمود دہلی میں تھی۔ لیکن پھر بھی بعض عناصر کی کمی بیشی اور زمان و مکان کے معمولی فرق نے لکھنؤ کی تہذیب میں کچھ اور خصوصیتیں پیدا کر دی تھیں جن کا عکس یہاں کی علمی اور ادبی زندگی میں نظر آتا ہے۔ یہ خصوصیتیں اکثر و بیشتر محض اختلاف کی شکل ہی نہیں، افراط و تفریط کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور جو فضا پیدا کرتی ہیں وہ اس کے پیشرو تہذیبی ماحول سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

جب اٹھارویں صدی میں دہلی کی مغل حکومت "شمشیر و سناں" کی منزل سے نکل کر "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہوئی تو اودھ میں بھی ایک نیم خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد امین برہان الملک سعادت خاں تھے جن کی رگوں میں بھی خون گردش کر رہا تھا وہ نیشاپور ایران کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی شجاعانہ کارگزاریوں کے لئے مشہور رہے۔ یہیں اس پہلی خصوصیت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جسے لکھنؤ کی تہذیب میں ایرانیت یا شیعیت کے عنصر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گو دہلی کی درباری اور جاگیردارانہ فضا اس اثر سے محفوظ نہیں تھی، لیکن یہاں اس کا اثر زیادہ گہرا اور نمایاں تھا۔ کیونکہ اس دفعہ اس میں حکومت بھی شامل تھی۔ اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی، تنگ نظری یا عصبیت کی شکل میں نہیں، ایک قسم کی جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا اور چونکہ حکومت اور عوام دونوں نے اس سے گہرے شغف کا اظہار کیا اس لئے اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی زندگی، موسیقی، فن تعمیر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے فنون لطیفہ پر پڑا۔ علمی حیثیت سے یہ ہوا کہ فارسی اور عربی

علوم کو دوبارہ زندگی ملی، فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، منطق اور طب کی تعلیم عام ہوئی۔ علماء اور فضلاء کی محفلوں سے باہر عام گفتگو میں بھی فارسی عربی الفاظ، فقرے، تلمیحات اور اصطلاحات رائج سکوں کی حیثیت سے جگہ پا گئے اور زبان دانی کا معیار دہلی سے مختلف ہو گیا۔ ابتدا میں یہ بات غیر شعوری رہی ہوگی کیونکہ لکھنؤ کے کوچہ و بازار مسجد و منبر، فوج اور دربار دہلی سے آنے والے مہاجرین سے بھرے ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ مقامی اثرات، انفرادیت اور خود اختیاری کے جذبے نے غیر واضح اور چھوٹے چھوٹے اختلافات کو شعوری بنا دیا۔ اس طرح لب و لہجہ اور محاورات، الفاظ کے ترک و قبول اور طرز اظہار میں فرق آیا تو ادب کی دنیا بھی بدل گئی۔ یہ بات پھر یاد دلا دینا ضروری ہے کہ فرق بنیادی نہ تھا۔ ان کا تعلق مسائل حیات اور فلسفۂ زندگی سے نہ تھا، ماضی، حال اور مستقبل کے نئے تجزیے سے نہ تھا، تاریخ کے کسی نئے تصور، شاعری کے کسی دوسرے نظریے سے نہ تھا۔ یہ فرق زمان و مکاں کے معمولی تغیر کا نتیجہ تھا۔ اور جاگیردارانہ انحطاط پذیر تہذیب کے دائرے کے اندر ہی اس کی بھی جگہ تھی۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں کے شعر و ادب میں زبان و بیان کی اہمیت، لب و لہجہ پر زور، تصنع اور رعایت لفظی، حسن و عشق کے خارجی لوازم اور ایک قسم کی سطحیت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کے اخلاقی تصورات، پرستاری فن، شعر و ادب کو تہذیبی زندگی کا جزو بنا دینے کی کوشش، ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔

(باقی آئندہ)

(طابع و ناشر پرنٹر و پبلشر نے مسلم پرنٹنگ کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا)

ہماری صحافت

(بسلسلۂ گزشتہ)

۲۴۔ نجم عالم۔ مراد آباد ایڈیٹر قاضی عابد علی رضوی نجم مراد آبادی
ایم علی عابد رضوی

۲۵۔ جمہوریت بمبئی " حامد الانصاری غازی

۲۶۔ جمہور (پندرہ روزہ) علی گڑھ ایڈیٹر محمد عمر خاں عمر

۲۷۔ علی گڑھ " " " " مینا زبیری

۲۸۔ عینک " " " اے احمد عرفانی اللہ
ظہیر احمد اور شبیر حسن۔

۲۹۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ " " شریف الحسن نقوی (مستقل مدیر)

۳۰۔ ہماری زبان ہفتہ وار " آل احمد سرور

۳۱۔ الکلام " بنگلور " سید غوث محی الدین

۳۲۔ جمہور " " " احمد اللہ خاں

۳۳۔ طوفان میل " " " منشی نیاز وارثی

۳۴۔ غزل " " " شہاب یزدانی

۳۵۔ جمیل " بہاولپور " ذکریا اسعدی

۳۶۔ ذوالقرنین " بدایوں " محمد احمد الدین نظامی

۳۷۔ نیا ہندوستان " حیدرآباد دکن " شیخ محمد بی۔ اے آنرز

۳۸۔ مضافات " محبوب نگر " کے وینکٹ رام

۳۹۔ الفاروق " کامٹی " عبدالستار فاروقی

۴۰۔ فنکار " بمبئی " شمس کنول

۴۱۔ پرواز " وارنگل " خواجہ نصیر الدین حسن

۴۲۔ روشنی " سرینگر کشمیر " اے عزیز

۴۳۔ ناظرہ " بلند شہر " پرتھوی راج

۴۴۔ نئی کرن " خورجہ " گلزاری لال

۴۵۔ ہم لوگ " اکولہ " عبدالصمد جاوید

۴۶۔ سنگم " داناپور کینٹ پٹنہ " غلام سرور

۴۷۔ ریاست " دہلی " سردار دیوان سنگھ مفتون

۴۸۔ سوویت دیس (پندرہ روزہ) " جی۔ ایلی سوف

۴۹۔ سوویت یونین کی خبریں اردو میں نئی دہلی " " " "

۵۰۔ آج کا امریکہ "

۵۱۔ اردو (پندرہ روزہ) جونپور " ظفر احسن ظفر صدیقی

۵۲۔ آئینۂ عہد محمد شفیع، ممتاز احمد قاسی۔ خیالات بیٹ

۵۳۔ جرأت " کلکتہ " جوہر غازی پوری

۵۴۔ شاکر " مدراس " حامد علی شاکر

۵۵۔ قومی زبان " کراچی " معین الدین (باقی)